طلبہ کے علی میاں ندویؒ

نگارش:

ریاض احمد انصاری رشادی

ہم نے اپنے اس مقالے کے لیے

دل کو جو چبھے وہی حصے لیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بڑا آدمی

۱۹۷۵ کے آس پاس کی بات ہے۔ مشہور شاعر جلالؔ کڑپویؒ ایک ''بڑے آدمی'' کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، مجلس میں اور لوگ بھی موجود تھے ''بڑے آدمی'' کو معلوم ہوا کہ جلالؔ کڑپوی مشہور شاعر ہیں تو انہیں اپنا کوئی کلام سنانے کی فرمائش کی۔

جلالؔ کڑپوی نے عرض کیا ''حضرت! آپ کو سنانے کے لائق تو میرے پاس کچھ نہیں، البتہ میں نے چھوٹے بچوں کے لیے آسان زبان میں ایک نعت کہی ہے۔ اجازت ہو تو وہی سنا دوں۔

''بڑے آدمی'' نے کہا: ''آپ نے 'نعت' کی بات کہی ہے، نعت کے سامنے تو ہم سبھی بچے ہی ہیں؛ شوق سے سنایئے''۔

جلال کڑپوی نے نعت سنانی شروع کی

کیسے پیارے اپنے رسول
کتنے اچھے ان کے اصول
سب کو کھلانا اک عادت
بھوکے رہنا اک معمول
شاہِ عرب ہیں شاہِ عجم
پیوندوں میں ان کے ببول
برف بنادے دوزخ کو
ایسی ان کی راہ کی دھول
ہر گالی پر ایک دعا
کانٹے لے کر بانٹے پھول
سَر دے کر 'سردار' ہوا
ان کا نواسہ ابنِ بتولؓ
آپ کا اک خادم ہے جلالؔ
حشر میں اس کو جاؤ نہ بھول
کیسے پیارے اپنے رسول
کتنے اچھے ان کے اصول

جس بزرگ نے بڑی سادگی سے کہا کہ نعت کے سامنے تو ہم سبھی بچے ہی ہیں اور بڑے اشتیاق سے نعت سننے لگے، یہ نعت سننے والے ''بڑے آدمی'' کون تھے؟

دنیاے اسلام نے انہیں بہت اونچے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ ''مفکر اسلام'' ''مؤرخ اسلام''، ''شیخ الاسلام''، ''الشیخ الھندی'' اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ یہ سب القاب بالکل مناسب۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ ایک طالب علم تھے، ایک سچے طالب علم۔ ایک ایسے طالب علم کہ علم کا سمندر پی گئے مگر پیاس نہ بجھی۔ آپ کے وسعتِ مطالعہ کا ہلکا سا اندازہ آپ کے رسالے ''میری علمی ومطالعاتی زندگی'' سے ہوسکتا ہے اور بات بھی یہی ہے کہ حقیقی طالب علم کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ چنانچہ سنن دارمی میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا اثر منقول ہے کہ مَنْهُومَانِ لا يَشْبَعَانِ طَالِبُ عِلْمٍ وَ صَاحِبُ دُنْيَا: یعنی دو پیاسے ایسے ہیں کہ ان کی پیاس کبھی نہیں بجھتی؛ ایک علم کا پیاسا، دوسرا دولت کا پیاسا۔ [سنن الدارمی، رقم الحدیث ۳۳۸]

آئندہ سطور میں حضرت علی میاں ندویؒ کی باغ وبہار زندگی سے چند خوشے چننے کی طالبعلمانہ کوشش کی گئی ہے۔

کتب خانہ ابوالحسن علی

ہوتا یہی ہے کہ آدمی پہلے لکھنا پڑھنا سیکھتا ہے۔ پھر لکھنے پڑھنے میں ایک عرصہ گذرنے کے بعد اسے اپنے لیے کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کا خیال آتا ہے۔ پھر

دھیرے دھیرے آدمی اپنا ایک ذاتی کتب خانہ بنالیتا ہے۔ مگر حضرت علی میاں ندویؒ کی تو بات ہی نرالی تھی۔ آپ کو اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کا ذوق اسی وقت سے دامن گیر تھا جب کہ آپ کی عمر بہت چھوٹی تھی اتنی چھوٹی کہ آپ کو پڑھنا ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت علی میاں ندویؒ کے پاس کچھ پیسے آگئے۔ وہ ایک دو آنے سے زیادہ نہ تھے۔ اس وقت حضرت علی میاں ندوی بہت چھوٹے بچے تھے، انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب ہر دکان میں نہیں ملتی، کتب فروشوں کے یہاں ملتی ہے، ہر چیز کی دکان الگ الگ ہوتی ہے۔ پیسہ لیا، گھر سے نکلے اور سیدھے بازار جا پہنچے۔ سامنے جو دکان نظر آئی، اس میں چلے گئے اور دکاندار کے سامنے پیسے بڑھا کر کہنے لگے ''کتاب دیجئے''۔

یہ کسی دوافروش کی دکان تھی، دوائی کی دکان میں کتاب کیا ملتی، دکاندار سمجھ گیا کہ کسی شریف گھرانے کا بھولا بھالا بچہ ہے، دواؤں کی فہرست اردو ہی میں تھی۔ اس نے دل رکھنے کی خاطر وہی اٹھا کر دیدی اور پیسے بھی واپس کر دیے۔

حضرت علی میاں ندویؒ بڑے خوش ہوگئے، خوشی اس بات کی تھی کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس مل گئے۔ خوشی خوشی گھر پہنچے اور اپنی اس نئی ''کتاب'' کو اپنے کتب خانے میں سجادیا۔ جس کا نام خود آپ نے ''کتب خانہ ابوالحسن علی'' رکھا تھا اور اس چھوٹے سے ''کتب خانہ ابوالحسن علی'' میں

حضرت علی میاں ندوی نے اپنے ابا جان سے لی ہوی وہ ساری کتابیں سجا رکھی تھیں جو والد صاحب کے لیے ضرورت سے زائد تھیں اور وہ انہیں از راہِ شفقت فرزندار جمند کو عطا کر دیا کرتے تھے۔

جلسۂ سیرت النبی ﷺ کا مقرر

حضرت علی میاں ندویؒ کو کتابیں جمع کرنے کا شوق وراثتاً ملا تھا۔ آپ کمسنی ہی میں اپنے شوق سے کتابیں جمع بھی کرتے گئے اور جب کچھ کچھ پڑھنے کی شدھ بدھ پیدا ہوی تو آپ نے مزے لے لے کر کتابیں پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ آپ کے محلے میں ایک پھیری والا کتابیں بغل میں دبائے، آوازیں لگاتے، آتا ''ہرنی نامہ'' ''نور نامہ'' ''حلیمہ دائی کی کہانی'' ''معجزۂ آلِ نبی'' ''میلاد نامہ'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ کتابیں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں، بس دو ورقی، چار ورقی۔ دو آنے، چار آنے میں مل جاتیں۔ آپؒ ان میں سے اچھی کتابوں کو خریدتے اور بہت شوق سے پڑھتے۔ خصوصاً سیرت پاک پر اردو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں آپ نے پڑھیں اور خوب پڑھیں۔

اسی شوق کا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف آٹھ نو سال کی عمر میں آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جلسہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اسی شوق میں آپ محلے کے گھر گھر پھرے، اپنے ہم عمر بچوں کو جمع کیا۔ بڑی بہنوں نے سر پر چھوٹی سی پگڑی بھی

باندھ دی۔ محلے کے بچے جمع ہو گئے تو آپ نے اپنے کتب خانہ سے سیرت پاک کی کوئی کتاب نکالی اور بلند آواز سے سنانی شروع کی۔ بعد میں آپ نے بڑے ہو کر خود لکھا ہے کہ اس وقت میری لیاقت کا عالم یہ تھا کہ حضور ﷺ کے دادا کا نام عبدالمُطّلِب کے بجائے عبدُ المَطْلَبْ پڑھ رہا تھا۔

آپ کے والد مولانا حکیم عبدالحئی صاحب، خود بہت بڑے عالم اور مؤرخ تھے، ہمیشہ اپنے تصنیفی کاموں میں مشغول رہتے۔ جلسۂ سیرت النبی کے اس ننھے مقرر پر اچانک نظر پڑی تو بہت خوش ہوے، چپکے سے ایک کنارے کی اوٹ لے کر ٹھہر گئے اور سننے لگے۔ خدا جانے اس موقع پر کیا کیا دعائیں والدِ مبارک کے سینے سے نکل کر مستجاب ہوی ہوں گی۔

استاذ کی مار پھولوں کا ہار

استاذ شاگرد کو لگاتار پیٹے جا رہے تھے۔ پیٹنے والے کا نام تھا مولانا خلیل عرب صاحب، اور پٹنے والے یہی تھے ہمارے حضرت علی میاں ندوی، اور پیٹے جانے کا سبب یہ تھا کہ مولانا خلیل عرب صاحب سے جناب خلیل الدین صاحب ہنسوی نے یہ شکایت کی تھی کہ ''آج سبق پڑھانے گیا تو علی میاں نے کہا' آج فلاں عذر کی وجہ میں سبق نہیں لے سکوں گا'، یہ کہا اور بس پھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے ناقدری سی محسوس ہوی''۔ جناب خلیل الدین صاحب ہنسوی سے

حضرت علی میاں ندوی انگریزی سیکھا کرتے تھے۔

مولانا خلیل عرب صاحب، علی میاں ندویؒ کے عربی ادب کے استاذ تھے اور ایک معنی میں اتالیق بھی۔ انہوں نے پہلے تو علی میاں کے بڑے بھائی جناب سید عبدالعلی صاحبؒ، جو علی میاں کے سرپرست بھی تھے، سے کہہ سن کر اجازت لے لی کہ آج علی میاں کی خوب خبر لوں گا، استاذوں کی ناقدری کرتا ہے۔ پھر علی میاںؒ کو بلا کر خوب سخت سست کہا اور بہت مارا پیٹا۔

علم کے راستے میں کبھی کبھار بہت سخت مقام آتے ہیں، حقیقی طالب علم ہی ان مقامات سے صحیح سالم گذر سکتا ہے..... اور پھر یہ بھی تو ہے کہ دینی علم نہ صرف دنیا میں سرفرازی بلکہ آخرت میں بھی نجات کا ضامن ہے، بھلا اتنا قیمتی علم بے قدری سے کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ جن ذریعوں سے علم حاصل ہوتا ہے ان تمام ذریعوں کی قدر کرنی چاہیے، کتابوں کی قدر، کاپیوں کی قدر، کاغذ اور قلم کی قدر، درس گاہ کی قدر، اور سب سے بڑھ کر استاذ کی قدر۔ استاذ کی ذرا سی ناقدری کی جائے تو علم ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔

پانی کی ٹنکی لبالب بھری ہو مگر غسل خانے کی ٹونٹی ہی بند ہو تو کیا پانی مل سکتا ہے؟ کیسے ملے گا، ہرگز نہیں مل سکتا۔ بس اسی طرح استاذ کا دل بند ہو تو علم کا نور استاذ کے دل سے شاگرد کے دل میں ہرگز منتقل نہیں ہوسکتا۔

بات یہ نہیں تھی کہ حضرت علی میاں ندویؒ نے انگریزی کے استاذ کی

واقعتاً ناقدری کی ہو۔حضرت علی میاں تو ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہوتا یہ ہے کہ آدمی کرتا کچھ ہے اور دیکھنے والے سمجھتے کچھ ہیں، اور ہر موقع وضاحت کرنے کا ہوتا نہیں، بس بات گنجلک رہ جاتی ہے۔ بھلا علی میاںؒ کیوں دروازہ پھٹ سے بند کرنے لگیں .....خیر.....مگر استاذ نے یہی سمجھا اور اپنی ناقدری محسوس کی۔

ذکر یہ چل رہا تھا کہ مولانا خلیل عرب صاحب نے حضرت علی میاں کو اچھی طرح پیٹا۔ بعد میں خود انہیں بھی خیال ہوا کہ شاید میں نے زیادہ مار دیا ہے۔ اتنا نہیں مارنا چاہیے تھا۔علی میاں کو بلایا اور معذرت بھی کر لی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

ہوتے ہوتے یہ خبر حضرت علی میاں ندوی کی والدہ کو بھی پہنچی کہ مولانا خلیل عرب صاحب نے ان کے بچے کو بہت مارا پیٹا ہے۔انہوں نے بیٹے کو بلایا اور پورا ماجرہ سنانے کے لیے کہا۔حضرت علی میاں ندویؒ نے والدہ کے حضور قصہ یوں سنایا کہ امی جان، غلطی میری ہی تھی، میں نے یہ کیا تھا اور یہ کیا تھا اور یہ غلطی مجھ سے ہوگئی تھی، اس لیے استاذ نے بس ذرا سی تنبیہ کی ہے اور کوئی بات نہیں۔بس اتنی سی بات ہے۔

بیٹے کی زبانی یہ سب سن کر والدہ صاحبہ جو خود بھی بہت نیک خاتون تھیں، مطمئن ہوگئیں کہ اتنی سی تو بات ہے، لوگ رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے، ہم اور آپ اس جگہ ہوتے تو اپنی والدہ سے کیا کہتے؟

کچھ نہ سہی تو یہ ضرور کہتے کہ امی غلطی تھوڑی تھی مگر استاذ نے مارا بہت ہے۔ مگر نہیں، حضرت علی میاں ندوی استاذ کی قدر کرنا جانتے تھے، وہ جانتے تھے کہ استاذ کی مار پھولوں کا ہار ہوتی ہے اور استاذ کی ڈانٹ سونے کی کھاٹ۔

استاذ کی مار سہنے بلکہ استاذ کی طرف سے مدافعت کرنے کا پھل یہ ملا کہ انہی مولانا خلیل عرب صاحب سے عربی پڑھ کر حضرت علی میاں ندوی عربی زبان کے بہت بڑے ماہر بنے۔ اتنے ماہر کہ خود وہ لوگ جو عرب ملکوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی مادری زبان عربی ہوتی ہے، وہ خود حضرت علی میاں ندویؒ کی کتابیں پڑھ کر اچھی عربی لکھنا اور بولنا سیکھتے ہیں۔

سچی بات

اِنہی استاذ مولانا خلیل عرب صاحب کا ذکر ہے۔ استاذ مولانا خلیل عرب صاحب عربی ادب کا درس دے رہے تھے اور سبق لینے والی جماعت میں صرف دو بچے تھے، ایک حضرت علی میاں ندویؒ اور دوسرے ان کے ساتھی حسین ابن محمد عرب۔

مولانا خلیل عرب صاحب عربی زبان پڑھانے کے بہت ماہر تھے۔ وہ بچوں کو عربی پڑھاتے نہیں تھے، پلا دیتے تھے۔ پڑھانے اور پلانے کا فرق ہم اچھی طرح جانتے ہیں، مولانا خلیل عرب صاحب جب پڑھاتے تو پڑھاتے وقت

ایک عجیب خوشی اور مسرت کا ماحول بنا رہتا۔

خیر، تو ایک دفعہ پڑھاتے پڑھاتے مولانا خلیل عرب صاحب کو چاے کی طلب محسوس ہوی۔ انہوں نے چاے کی فرمائش کی تو گھر کے اندر سے جواب ملا کہ شکر ختم ہوگئی ہے۔ عرب صاحب نے اسی وقت ایک روپیہ نکال کر حسین کو دیا کہ دوڑ کر شکر لے آؤ۔ وہ سیر بھر شکر لے آے جو غالبًا اس وقت دوڈھائی آنے کی ملتی تھی۔ شکر لے کر آے، گھر میں شکر دی اور اِدھر ریزگاری واپس کی، پھر سبق میں بیٹھ گئے۔ عربی کتاب ''کلیلۃ و دِمنہ'' کا سبق چلتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اچانک عرب صاحب نے حسین سے کہا: ''ایک روپیہ دیا تھا، بقیہ پیسے کیا ہوے؟''۔ حسین تو ''کلیلۃ و دِمنہ'' کی باغ و بہار عبارت میں گم تھے، اب انہیں کہاں یاد تھا کہ بقیہ پیسے انہوں نے کسے دیے ہیں۔ یہ تو یاد تھا کہ پیسے لوٹا دیے ہیں، مگر کب، کہاں، کیسے، کچھ یاد نہ آتا تھا۔ عرب صاحب بہت ناراض ہوے، کہا:

''یہاں تھا کون؟ یا تو میں تھا، یا علی، یا تم؟ آخر ریزگاری گئی کہاں؟ معلوم ہوتا ہے تیری عادت خراب ہوگئی ہے''۔

حسین کا عجب حال ہوگیا، بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ کہتے ہی رہے کہ میں نے ریزگاری واپس کی تھی، لیکن خیر.....اب ریزگاری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پھر سبق شروع ہوگیا۔ وقت ختم ہوا، سبق بھی ختم۔ سب اٹھ کر چلے گئے اور

بات آئی گئی ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد حضرت علی میاں نے کتاب کھولی۔ یہ ''کلیلۃ ودِمنہ'' کا بڑے سائز کا ایڈیشن تھا۔ کتاب کی جلد ڈھیلی تھی، اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ ریزگاری کتاب کی سیون میں ایک قطار کی طرح رکھی ہوی ہے۔ اب ان کا حال عجب ہوگیا، کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔

ہوا یہ ہوگا کہ حسین نے یا عرب صاحب نے ریزگاری اس کتاب میں رکھی، ہوا کے زور سے صفحات الٹ گئے، اس وقت تو خیال نہ ہوا۔ بعد میں عرب صاحب کو اپنی ریزگاری یاد آئی، حسین سے مطالبہ کرنے لگے۔ پڑھنے پڑھانے کے انہماک میں کسی کو بھی یاد نہ رہا۔ جس کتاب کا درس چل رہا تھا ریزگاری اسی کے ورق تلے دبی رہی۔

اب حضرت علی میاں ندویؒ نے اپنی کتاب میں ریزگاری دیکھی تو بہت پریشان ہوے۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آتے تھے۔ عرب صاحب کا مزاج گرم ہے، اب انہیں ریزگاری کے بارے میں بتاؤں تو کیا خبر وہ میرے بارے میں کیا سوچیں''، میں نے ریزگاری چھپالی تھی، اس کے بعد کچھ خیال ہوا، اب واپس کررہا ہوں''

ہم اور آپ ہوتے تو ہمیں یہ خیال ضرور آتا کہ ریزگاری کا معاملہ ٹھنڈے بستے میں ڈال دیں، استاذ کو کچھ نہ بتائیں، اور شاید ہم اس پر عمل بھی

کر لیتے۔ مفت کی بدنامی بھلا کون گوارا کرے گا۔ مگر حضرت علی میاں ندویؒ نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا جھوٹ تھا۔ بات کا جھوٹ نہیں، عمل کا جھوٹ۔ اور جھوٹ ہونے میں دونوں مساوی ہیں۔

پھر حضرت علی میاں ندوی نے کیا کیا؟

یہ کیا کہ جب استاذ آئے تو آپ نے سارا قصہ صاف صاف سنا دیا اور ریزگاری بڑھا دی۔

اب یہ بھی سن لیجئے کہ اس صاف، سیدھے اور کھرے سچ کا نتیجہ کیا ہوا؟

استاذ محترم نے ریزگاری لے لی اور کچھ نہیں فرمایا۔

اس موقع پر ہمیں اسماعیل میرٹھی کا یہ سادہ مگر پرمغز شعر اپنی گرہ میں باندھ لینا چاہیے۔

جھوٹ کی بھول کر نہ ڈالو خو
جھوٹ ذلت کی بات ہے آخ تھو

علی میاں کا فتویٰ

ہمارا ملک ہندوستان صوفی سنتوں کا ملک کہلاتا ہے۔ برسہا برس سے ہندو اور مسلمان مل جل کر رہ رہے ہیں۔ آزادئ ہند میں بھی دونوں نے حصہ لیا اور آزادی کے بعد جب ملک کا دستور بنایا گیا تو ملک کے ہر باشندے کو اپنے اپنے

مذہب پر عمل کرنے، بلکہ اسے پھیلانے کی بھی آزادی دی گئی۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ملک کی یو پی سرکار کی طرف سے تمام اسکولوں میں یہ ضروری قرار دیا جانے لگا کہ اسکول کے سب بچے تعلیم شروع ہونے سے پہلے وندے ماترم کا ترانہ گائیں۔ وندے ماترم کا ترانہ ایک بنگالی ہندو شاعر نے لکھا تھا۔ اس ترانے کا مطلب کچھ ایسا بنتا ہے کہ یہ بھارت کی زمین ہمارا خدا ہے اور ہم زمین کی عبادت کرتے ہیں۔ ہندو شاعر کے عقیدے میں شاید یہ بات درست ہو مگر ہم مسلمان تو صرف اور صرف خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ ہم بھارتی زمین کی عبادت کیوں کریں گے۔ زمین تو خود ہی اللہ کی عبادت کر رہی ہے۔

حکومت کو جانے کیا سوجھی کہ وندے ماترم کو اسکولوں میں لازم کر دیا گیا، جب کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا قومی ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' وندے ماترم کے بالمقابل بہت ہی سلیس اور عمدہ ہے اور سب لوگ اسے سمجھتے بھی ہیں لیکن جب حکومت کی طرف سے زبردستی وندے ماترم اسکولوں میں تھوپا گیا تو مسلمانوں کو فکر ہونے لگی؛ اس بات کا بھی امکان تھا کہ اسکولوں کے بعد مدرسوں میں بھی اس ترانے کو لازم کر دیا جاتا۔

مسلمانوں کی بہت ساری تنظیموں اور جماعتوں نے حکومت کے اس حکم کے خلاف جلسے جلوس کیے۔ تقریریں ہوئیں، تجویزیں پاس ہوئیں مگر

حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی اور حکومت نے کسی بات کا نوٹس نہیں لیا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک ٹیلی ویژن کے نمائندہ نے حضرت علی میاں ندویؒ سے وندے ماترم کے بارے میں آپ کی رائے پوچھی۔

یہاں یہ بات بھی ہمیں ذہن میں رکھنی ہوگی کہ وندے ماترم کا صحیح معنی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کسی کسی نے وندے ماترم کو ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جیسا ایک قومی گیت سمجھ کر اسے پڑھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

بہرحال جب ٹیلی ویژن کے نمائندے نے حضرت علی میاں ندویؒ سے وندے ماترم کے بارے میں رائے پوچھی تو آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ہونے کی حیثیت سے سلطانِ جائر کے روبرو کلمۂ حق کی شہادت دیتے ہوے دوٹوک الفاظ میں فرمایا:

''یہ حرام ہے، مسلمانوں کے بچے اس کو نہیں پڑھیں گے، اگر حکومت نے مجبور کیا تو ہم مسلمانوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکولوں سے نکال لیں''۔

ٹیلی ویژن کے نمائندے نے حضرت علی میاں کے اس ارشاد کو ''علی میاں کا فتویٰ'' کہہ کر براڈکاسٹ کیا اور پورے ملک میں ''علی میاں کے فتویٰ'' کی گونج سنی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے ''اِنَّ مِنْ اَعْظَمِ الْجِهَادِ كَلِمَةَ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ یعنی ''ظالم بادشاہ کے سامنے عدل وانصاف کی بات پیش کر دینا سب سے بڑا جہاد ہے'' [سنن الترمذی، رقم الحدیث ۲۱۰۰] حضرت علی میاں ندوی نے اپنے بے غبار قول سے ثابت کر دیا کہ اسلام پر آنچ آے تو آپ بڑی سی بڑی قوت سے ٹکرانے کا عزمِ مصمم رکھتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ حضرتِ علی میاں ندوی کے اس عزمِ مصمم کا اثر نہیں ہوتا۔ اثر ہوا اور بہت اثر ہوا، وہ حکومت جو مسلمانوں کے بڑے بڑے اجتماعات ، جلسے جلوس اور تجویزوں پر کان نہیں دھر رہی تھی ، اسے مجبور ہونا پڑا اور دوسرے ہی دن حکومت کے وزیرِ داخلہ کو یہ بیان دینا پڑا کہ وندے ماترم تمام بچوں کے لیے لازمی نہیں کیا گیا ہے۔ جو چاہے اس میں شریک ہو، جو چاہے شریک نہ ہو۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ریاستی حکومت کے جس وزیر نے ایسا حکمنامہ جاری کیا تھا، حکومت نے اسے وزارت ہی سے برطرف کر دیا۔

کمسن مبلغ

ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر تھے ڈاکٹر بی آر امبیڈکر صاحب۔ ہندوستان کا جو دستور بنایا گیا ہے ، یہ پورا دستور تو انہوں نے نہیں بنایا ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس دستور ساز کمیٹی کے یہ صدر تھے۔ اسی سے ہم یہ

سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر خود کتنے بڑے علم والے اور سمجھ والے ہوں گے کہ انہیں دستور ساز کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔

درمیان میں جانتے چلیں کہ ہندوستان میں ایک قوم رہتی ہے جسے اچھوت کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ اچھوت بھی ہندو ہی ہیں لیکن خود ہندوؤں میں ان کا کچھ وقار نہیں۔ بڑے ہندو، اچھوتوں کی اتنی بے عزتی کرتے تھے اور انہیں اس طرح ذلیل کرتے تھے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔

اچھوتوں پر یہ لازم تھا کہ وہ راستے کے بیچوں بیچ نہ چلیں، کنارے کنارے چلیں۔ اس لیے کہ راستے کے درمیان تو بڑے ہندو چلتے ہیں اگر اچھوت بھی اسی جگہ چلتا رہے تو ہوسکتا ہے کہ بے خبری میں کسی موقع پر اچھوت کا سایہ سامنے سے آنے والے بڑے ہندو کے جسم پر پڑ جائے اور بڑے ہندو اچھوتوں کا سایہ بھی اپنے اوپر پڑنے کو بہت برا سمجھتے تھے۔ جس کنویں سے بڑے ہندو پانی بھرتے تھے وہاں اچھوتوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اچھوت اگر کوئی چیز بڑے ہندوں کو دینا چاہے تو ہاتھوں سے نہیں دے سکتے تھے۔ جو کچھ دینا ہوا سے کسی جگہ پر رکھ دیتے، پھر وہاں سے دور ہٹ جاتے، اس کے بعد بڑا ہندو آکر وہ چیز اٹھا لیتا۔ بڑا ہندو پڑھ لکھ کر ڈاکٹر انجینئر بن سکتا تھا مگر اچھوتوں کو سرے سے پڑھنے لکھنے ہی کی اجازت نہیں تھی۔ اچھوتوں کا کوئی اسکول ہی نہیں تھا۔ ممکن ہے مسلمان بھائیوں کو ان باتوں پر ہنسی بھی آتی ہو۔

ہمارے مذہب میں ایسا کہاں ہے، یہاں تو علی الاعلان اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر، اچھوتو ں کے ساتھ بڑے ہندؤں اس ظالمانہ برتاؤ کے سخت مخالف تھے۔ اچھوتوں کو سماج میں عزت ملے اس کے لیے انہوں نے بہت محنت کی ، بہت کوششیں کیں۔ بالآخر دھیرے دھیرے ڈاکٹر صاحب کی کوشش رنگ لائی اور اچھوتوں کو کچھ کچھ عزت دی جانے لگی۔ اچھوت بھی عام لوگوں کے ساتھ جینے لگے، اس بات سے اچھوتوں کو بہت خوشی ہوی اوران کے دلوں میں ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر کی بہت عزت ہوگئی۔

انہی دنوں ڈاکٹر صاحب نے یہ سوچا کہ اپنے اوراپنی اس جماعت کے لیے دنیا میں جاری مذاہب میں سے کوئی ایک مذہب پسند کرلیں۔ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے، تمام مذاہب کا خوب مطالعہ کرنے لگے اورغور وفکر بھی کرنے لگے۔ اِدھر ہندؤں ، عیسائیوں ، بدھشٹوں اور مسلمانوں کو بھی یہ بات معلوم ہوی کہ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر اپنی جماعت کے ساتھ جلد ہی کسی مذہب کے پیروکار بننے والے ہیں۔ سب مذہب والوں نے انہیں اپنے اپنے مذہب میں لانے کی کوششیں شروع کیں۔

حضرت علی میاں ندوی کی عمر اس وقت صرف اکیس سال تھی۔ بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی اوراستاذِ محترم مولانا خلیل عرب صاحب نے حضرت علی میاں ندوی کو

حکم دیا کہ بمبئی جاؤ اور امبیڈکر صاحب کو اسلام کی دعوت دو۔ علی میاں ندوی لکھنو سے بمبئی پہنچے اور اپنے ایک پہچان والے کے ہاں ٹھہر گئے۔ کسی کو معلوم ہوتا کہ یہ نوجوان امبیڈکر صاحب کو اسلام کی دعوت دینے آیا ہے تو اُسے ہنسی آجاتی۔

اِس حوصلے کو دیکھئے اور اِن کو دیکھئے

بہرحال حضرت علی میاں ندوی نے کسی طرح امبیڈکر صاحب کا پتہ معلوم کرلیا۔ دعوتِ اسلام سے متعلق دو چار کتابیں جو انگریزی زبان میں تھیں، اور پروفیسر پکتھال صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن، لکھنو سے ساتھ لائے تھے، اسے لیا اور ڈاکٹر صاحب سے ملنے چلے۔ ڈاکٹر صاحب کے بنگلے پر صبح صبح پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب ہواخوری کے لیے گئے ہوے ہیں۔ انتظار کے کمرے میں دیکھا تو اور بھی بہت سے بڑے بڑے لوگ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے بیٹھے ہوے تھے، حضرت علی میاں ندوی بھی وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر گذری ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب باہر سے لوٹے۔ موٹا تازہ جسم، درمیانہ قد، آنکھوں پر گول سی عینک، گندمی رنگت، ہاتھ میں چھڑی۔ انہوں نے انتظار گاہ میں بیٹھے ہوے لوگوں کو ایک نظر دیکھا اور سب سے پہلے حضرت علی میاں ندوی کو آنے کے لیے کہہ دیا۔

حضرت علی میاں ندوی کمرۂ ملاقات میں پہنچے جو ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ کا بھی کمرہ تھا۔ مطالعہ کی میز پر اک نگاہ ڈالی تو وہی پکتھال صاحب کا انگریزی

ترجمہ قرآن جو حضرت علی میاں امبیڈکر صاحب کو مطالعہ کے لیے دینے آئے تھے، پہلے ہی سے میز پر رکھا ہوا تھا۔ کتاب کے درمیان ایک پلیتا بھی نظر آرہا تھا، جس سے اندازہ ہوا کہ امبیڈکر صاحب نے اتنا حصہ پڑھ بھی لیا ہے۔

گفتگو شروع ہوی۔ حضرت علی میاں ندویؒ نے ٹھہرے ہوے لہجہ میں صاف صاف کہا:

''ڈاکٹر صاحب، آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہوں گے، اور انہوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہوں گی۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی اور اپنی برادری کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے تو میں آپ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں اور اس کے لیے کوئی رشوت یا ترغیب یا لالچ نہیں دیتا''۔

حضرت علی میاں ندویؒ کی کے نپے تلے جملے امبیڈکر صاحب نے بہت توجہ اور غور سے سنے، پھر کہا: ''یہ معاملہ بڑا سنجیدہ اور غور طلب ہے، میں مطالعہ کر رہا ہوں اور غور بھی، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر پاؤں گا''۔

گفتگو ختم ہوی۔ حضرت علی میاں ندوی نے محسوس کیا کہ اب مزید بیٹھنا مناسب نہیں تو اٹھنے سے پہلے وہ انگریزی دینی کتابچے جو وہ لکھنو سے لے آئے تھے امبیڈکر صاحب کو دیے کہ ان کا مطالعہ ضرور کیجئے۔ امبیڈکر صاحب نے بہت ادب واحترام سے کتابیں لیں، اپنے پاس رکھا اور نہایت ادب واحترام

سے علی میاں ندوی کو رخصت کیا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ افسوس کہ اس کے بعد کے واقعے کو بتانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ بہرحال بات تو پوری کرنی ہے۔ اس کے بعد وہی ہوا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے معاملے میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے اپنے اور اپنی برادری کے لیے بدھ مذہب پسند کیا، بدھشٹ ہو گئے۔

اس نفع وضرر کی دنیا میں آدمی کو حالات کا صحیح ادراک نہیں ہو پاتا۔ سمجھتا ہے کوئی کہ اس راہ میں چلنے سے بھلا ہوگا، لیکن رہ نوردی کے بعد پتہ چلتا ہے کہ سراب تھا وہ جسے ہم تالاب سمجھ رہے تھے، اک خواب تھا وہ جسے ہم حقیقت سمجھ رہے تھے۔

بعد میں- اپنی زندگی ہی میں- امبیڈکر صاحب کو احساس ہو گیا تھا کہ بدھ مذہب قبول کر کے انہوں نے غلطی کی ہے۔ ان کی قوم کے درد کا علاج بدھ مذہب میں نہیں۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سچ ہے، ہدایت خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ نہ دے تو کوئی بڑے سے بڑا عقلمند، سمجھدار شخص اپنی عقل کے بل بوتے پر راہِ ہدایت کو نہیں پا سکتا۔

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ﴾

ماحصل

حضرت علی میاں ندویؒ نے ہم طلبہ پر ایک بڑا احسان یہ بھی کیا ہے کہ اپنے حالات زندگی کو اپنی خودنوشت آپ بیتی ''کاروانِ زندگی'' میں جمع کردیا ہے، اس مقالے کی اکثر باتیں ''کاروانِ زندگی'' ہی سے لی گئی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کی زندگی پر لکھنے والا بڑے سے بڑا مقالہ نگار ''کاروانِ زندگی'' کی خوبی کو نہیں پہنچ سکتا۔

اس کتاب کے علاوہ بھی حضرت علی میاں ندویؒ نے ہم طلبہ کے لیے بہت ساری کتابیں لکھی ہیں، جیسے ''کاروانِ زندگی'' ''پرانے چراغ'' ''تاریخِ دعوت وعزیمت'' ''نبی رحمت'' ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' ''تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات'' ''جب ایمان کی بادِ بہار چلی'' ''پاجا سراغِ زندگی'' ''کاروانِ مدینہ'' ''دو مہینے امریکہ میں'' ''روائع اقبال'' ''القرأۃ الراشدہ'' ''المختارات من ادب العرب'' وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے چند کتابیں ایسی ہیں کہ حضرت علی میاں ندویؒ نے خود انہیں اردو میں لکھا ہے اور چند ایسی ہیں کہ حضرت علی میاں ندویؒ نے تو کتاب عربی میں لکھ دی تھی، کسی شاگرد نے اس کا اردو میں ترجمہ کردیا۔

آپ کی تفصیلی سوانح کے لیے ''کاروانِ زندگی'' کا مطالعہ کرنا مفید ہوگا البتہ کم ازکم اتنی باتیں تو ہم میں سے ہر طالب علم کو یاد رکھنی چاہیے کہ:

آپؒ کا پورا نام ''سید ابوالحسن علی'' تھا۔ ہندوستان میں آپ کو مفکرِ اسلام حضرت علی میاں ندوی کہا جاتا ہے اور عربستان میں الشیخ الندوی سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ''میاں'' کا لفظ خاندانی سیدوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا کر ملتا ہے۔ آپ یوپی کے ایک شہر رائے بریلی کے قصبے دائرہ شاہ علم اللہ، جسے 'تکیہ کلاں' بھی کہا جاتا ہے، میں ۶ر محرم الحرام ۱۳۳۲/ہجری کو پیدا ہوے۔ شمسی تاریخ تھی ۵ ڈسمبر ۱۹۱۳ء۔

وفات

چھیاسی برس کی انتہائی مصروف اور جد و جہد سے پُر زندگی گذار کر آپ اسی 'تکیہ کلاں' میں ۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ کو جمعہ کے دن، جمعہ کی نماز کی تیاری کے بعد سورۂ یاسین پڑھتے ہوے انتقال فرما گئے۔ شمسی تاریخ یاد رکھنا بہت آسان ہے، اس لیے کہ وہ دوسرے ہزارے کا آخری دن تھا یعنی ۳۱ ڈسمبر ۱۹۹۹ء''۔